اردن (اربد)

(نومبر ۲۰۰۸ عیسوی)

قاہرہ میں ہونے والی پہلی مصری اردنی بائیوٹیکنالوجی کانفرنس کا تجربہ بہت اچھا تھا۔اس لئے جب اسی سلسلے کی دوسری کانفرنس میں لیکچر کا دعوت نامہ ملا تو میں نے فوراً حامی بھرلی۔

۹ نومبر کو میں اردن کے شہر اربد کے لئے عازم سفر ہوا۔امارات ائرلائنز کے ذریعے لاہور سے دوبئ اور دوبئ سے عمان پہنچنا تھا۔ وہاں سے سڑک کے راستے اربد جانا تھا۔

لاہور ائرپورٹ پر تمام مراحل بخوبی طے ہوگئے۔رات ڈھائی بجے امارات کی پرواز لاہور پہنچی۔ جہاز سے اترنے والے مسافروں کا ایک لامتناہی سلسلہ تھا۔لگتا تھا کہ جہاز کے کونے کھدروں میں بھی مسافروں کو پیک کیا گیا تھا۔ جہاز میں سوار ہونے والے مسافروں کی تعداد بھی کم نہیں تھی۔اس بھیڑ کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہمارا جہاز ۳۰ منٹ لیٹ ہوگیا۔گماں سا ہوا کہ کہیں دبئ میں مشکل نہ ہو کیونکہ وہاں صرف ڈیڑھ گھنٹے کا ٹرانزٹ تھا۔

دبئ پہنچتے ہی میرے موہوم سے خدشات حقیقت کا روپ دھار گئے۔سامان سکین ہو رہا تھا اور ایک لمبی قطار تھی۔لوگوں کی منت سماجت کی اور آگے جگہ لی۔امارات والے اعلان کر رہے تھے کہ ان کی فلائٹیں روانگی سے پندرہ منٹ پہلے بند ہو جائیں گی۔

میری فلائٹ کا ٹائم ساڑھے سات بجے تھا۔میں سوچ رہا تھا کہ جیسے ہی سامان کی سکیننگ سے فارغ ہوں گا ٹہلتا ہوا دوسرے جہاز پر پہنچ جاؤں گا۔مگر جب باہر نکلا تو الیکٹرانک انفارمیشن بورڈ پر میری فلائٹ کا کوئی ذکر نہیں تھا۔انفارمیشن ڈیسک پر لمبی لائنیں لگی ہوئی تھیں۔ بہت تشویش ہوئی۔ میرے پاس صرف پچیس منٹ تھے۔اچانک الیکٹرانک انفارمیشن بورڈ پر پلک جھپکنے کے وقت کے لئے

میری فلائٹ آئی۔ تیسرے ٹرمینل پر گیٹ نمبر ۲۱۹ تھا۔ میں پہلے ٹرمینل پر گیٹ نمبر ۳۰ پر کھڑا تھا۔

مجھے حالات کی سنگینی کا اندازہ ہو گیا۔ اب دو ہی راستے تھے یا ائیرپورٹ شٹل کا انتظار کرتا یا دوڑ لگاتا۔ میں نے دوسرے راستے کا انتخاب کیا کہ یہ کلی طور پر میرے اختیار میں تھا۔ میں جتنی رفتار سے دوڑ سکتا تھا دوڑا اور تقریباً دو کلومیٹر کا فاصلہ سامان سمیت ۱۰ منٹ میں طے کیا۔ میں اس وقت جہاز تک پہنچا جب دروازے بند کئے جا رہے تھے۔ اور ایک دو منٹ اور لگ جاتے تو فلائٹ نہ ملتی۔ اگر فیملی ساتھ ہوتی تو تب بھی نہ ملتی۔

میں کچھ ہی عرصہ پہلے دبئی ائیرپورٹ آیا تھا۔ تب تو یہ اتنا بڑا نہیں تھا۔ ہوا دراصل یہ کہ کچھ ہی ماہ پہلے ٹرمینل تین کا افتتاح ہوا تھا جو دنیا میں سب سے بڑا ائیر ٹرمینل ہے اور جگہ کے گھیراؤ کے حساب سے دنیا کی دوسری بڑی عمارت ہے۔ اس کی وجہ سے دبئی ائیرپورٹ کا شمار دنیا کے مشہور ترین ہوائی اڈوں میں ہونے لگا ہے جہاں ہر سال سات کروڑ مسافر آتے ہیں اور ۱۴۰ ائیر لائینیں ساڑھے تین لاکھ پروازیں کرتی ہیں۔ ہفتے وار تعداد آٹھ ہزار بنتی ہے۔

میری سیٹ ایمرجنسی دروازے کے پاس تھی۔ ساتھ والی سیٹ پر ایک سری لنکن نوجوان تھا۔ اس سے گپ شپ ہوئی اور اندازہ ہوا کہ سفر اچھا گزر جائے گا۔ مگر جلد ہی فضائی میزبان میرے پاس آیا اور کہنے لگا کہ ایک صاحب ہیں جن کی ٹانگوں کا اپریشن ہوا ہے اور انہیں ٹانگیں پھیلا کر بیٹھنا پڑتا ہے کیا آپ ان سے سیٹ بدل لیں گے۔ میں نے حامی بھر لی۔ یہ اچھا ہی ہوا۔ ایک تو نیک کام ہو گیا۔ دوسرا مجھے کھڑکی والی سیٹ مل گئی۔ دن کا سفر تھا اور باہر تانک جھانک کی جا سکتی تھی۔

ہماری سمت شمال مغرب تھی۔ موسم بالکل صاف تھا اور ہر چیز صاف نظر آ رہی تھی۔ کہیں

کہیں بادل تھے مگر زمین بالکل یک رنگی تھی یعنی ہر طرف صحرا ہی صحرا تھا۔

آدھ گھنٹے کا سفر گزرا تو ایک حیرت انگیز مشاہدہ ہوا۔ ۳۶۰۰۰ ہزار فٹ کی بلندی سے دیکھتے ہوئے زمین پر بے شمار سبز دائرے نظر آرہے تھے۔ ان کا قطر کئی کلومیٹر میں ہوگا۔ اتنی تو بات سمجھ میں آگئی کہ ان کا تعلق زراعت سے ہے مگر انہیں سیراب کرنے کے لئے پانی کہاں سے آتا ہوگا جب کہ دور دور تک نہ کوئی دریا تھا نہ سمندر۔

بعد میں تحقیق کی تو پتہ چلا کہ یہ علاقہ سعودی عرب کا تھا اور اس مصنوعی زراعت کے لئے پانی تقریباً ایک کلومیٹر کی گہرائی سے نکالا جاتا ہے۔ اس پانی کا کوئی سرچشمہ نہیں۔ یہ اس گہرائی میں لاکھوں سالوں سے پڑا ہے۔ اسی لئے اسے fossil water کہتے ہیں۔ تیل کی طرح ایک دن یہ بھی ختم ہوجائے گا۔ اس طرح سے کاشت کی گئی زمین پر ہر طرح کی زراعت کی جاتی ہے۔ الفلفا (Alfalfah) سے لے کر گندم تک۔ ایک گول کھیت کا قطر تین کلومیٹر تک ہوسکتا ہے۔

میں جب عمان ائرپورٹ پر اترا تو تھکاوٹ اور نیند سے برا حال تھا۔ سامان بھی خاصی دیر

سے ملا اور تماشا یہ ہوا کہ باہر کوئی شخص میرے نام کا پلے کارڈ لے کر نہیں کھڑا تھا۔

جب میں مایوس ہو گیا اور اربد یونیورسٹی فون کرنے کا سوچنے لگا تو ایک صاحب میری طرف آئے اور استفہامیہ انداز میں گویا ہوئے:

'ڈاکٹر عبدالحق'

میں نے جواب دیا: 'یقیناً'

میں نے اطمینان کا سانس لیا اور اس سے پوچھا:

'پلے کارڈ کہاں ہے'۔

اس کا جواب فقط ایک مسکراہٹ تھی جسے دلنشین نہیں کہا جا سکتا تھا۔ وہ انگریزی نہیں جانتا تھا اس لئے یہی جواب ہو سکتا تھا۔

سادہ سا ائرپورٹ تھا۔ باہر یرموک یونیورسٹی کی بس کھڑی تھی۔ پتہ چلا کہ مصر سے کافی لوگ آئے تھے اور ان میں شناسا چہرے بھی تھے۔ حسب معمول میری پہلی فکر گھر اطلاع دینا تھی۔ انکشاف ہوا کہ ائرپورٹ پر انٹرنیشنل فون نہیں۔ وہ صاحب پھر مسکرائے اور اشاروں اشاروں میں تسلی دی کہ بس ایک گھنٹے کی بات ہے۔ یونیورسٹی سے فون ہو جائے گا۔

میں کبھی فون کرنے میں کوتاہی نہیں کرتا۔ جاپان کے پانچ سالہ قیام کے دوران میں ہفتے میں دو دفعہ رات آٹھ بجے گھر فون کرتا تھا۔ سوائے ایک دفعہ کے کبھی ایسا نہیں ہوا کہ میں نے فون نہ کیا ہو اور کبھی پانچ منٹ کی دیر بھی نہیں کی تھی۔ ایک دفعہ غیر معمولی حالات کی وجہ سے دو گھنٹے کی تاخیر ہو گئی۔ یہ تاخیر گھر والوں کے لئے قیامت خیز ثابت ہوئی۔ اب بھی تاخیر سے یہی ہونا تھا۔